بشیر احمد ڈار

یونانی تصوّف

(۴)

فلاطینوس مصری

اس منزل میں اگر دوسرے امتیازات ختم ہو جاتے ہیں تو پھر بھی ایک بڑا امتیاز من وتو کا قائم رہتا ہے یعنی ایک طرف تمام کائنات کی وحدت ہے اور دوسری طرف وہ ذاتِ مطلق ہے جو ہمارا مصدر و منبع اور ہماری منزل ہے۔ اس لیے فلاطینوس کا خیال ہے کہ انسان کو ابھی ایک اور قدم بڑھانا ہے جہاں یہ آخری تفریق بھی ختم ہو جانی چاہیئے۔ مشکل یہی ہے کہ انسانی فکر اس زمانی و مکانی ماحول کے باعث معروض و موضوع کی دوئی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتا اور اس آخری منزل میں اسی دوئی کو ہٹائے بغیر گذارہ بھی نہیں۔ اس وحدتِ مطلقہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں شعورِ ذات کو فنا کر دینا پڑے گا اور خدا میں ہر شے کو پانے کے لیے اپنے آپ کو ختم کرنا ہو گا۔ پچھلی منزل کی کوئی چیز اس جگہ نہ صرف کام نہیں آ سکتی بلکہ اسے اپنے شعور سے علاحدہ کرنا ضروری ہے۔ عقل و وجدان کے بعد محبت ہی ایک ذریعہ ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے لیکن یہ محبت عقل و وجدان کی آمیزش سے پاک ہونی چاہیئے۔ فلاطینوس اس منزل کو یوں بیان کرتا ہے "جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالمِ معقولات کا تصوّر کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ چیز ترک کر دیتی ہے۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجیے جو کسی شاہانہ محل میں داخل ہوتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ تو اس کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و خوبصورتی میں محو ہو جاتا ہے لیکن جب گھر کا مالک اس کے سامنے آتا ہے تو وہ یہ سب کچھ بھول جاتا ہے کیونکہ وہ مالک کوئی ساکن بُت یا کوئی آرائش کی چیز نہیں کہ اس کو کچھ عرصہ دیکھ کر دوسری چیزوں کی طرف توجہ کی جائے۔ وہ تو نو وارد کی تمام تر توجہ کا مرکز بننا چاہتا ہے۔ اس حالت میں وہ اس کی طرف مکمل یک جہتی سے دیکھتا رہے گا یہاں تک کہ اسے بھول جائے گا کہ وہ کسی خارجی شے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاہد اور مشہود ایک ہی ذات میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ وہ شے جو پہلے مشہود تھی اب اندرونی مشہود ہو جاتی ہے اور اس طرح ہر دوسری شے کی یاد اس کے ذہن سے اتر جاتی ہے۔ اس تشبیہ کو مکمل کرنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی ہو گی کہ مکان کا مالک انسان نہیں بلکہ خدا ہے اور یہ خدا محض ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہی نہیں ہوتا بلکہ ہماری روح میں پوری طرح سما جاتا ہے۔ پہلا دیکھنا نچلی منزل ہے جس میں شاہد و مشہود کی تفریق قائم رہتی ہے لیکن دوسرا دیکھنا انسان کو اپنی ہستی سے ماورا لے جاتا ہے اور عشق کی کارفرمائی سے دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اس شراب (عشق) سے اس کی عقل ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ اس وحدت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے جس میں اس کی روح کو تسکین کامل ملتی

ہے۔"[1] لیکن یہ آخری منزل انسان سے خارج میں کہیں موجود نہیں۔ جب ہم خدا کی ذات میں مدغم ہوتے ہیں تو گویا خود اپنی ذات کا تحقق حاصل ہوتا ہے۔" خدا کسی چیز کا غیر نہیں حتیٰ کہ اس شخص کا بھی غیر نہیں جو اس سے بظاہر بے نیاز ہوتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو اپنے نفس سے واقف ہے وہ اس وجود مطلق سے بھی واقف ہوگا جو اس کائنات اور اس کے وجود کا مصدر و منبع ہے۔" (باب ششم، کتاب نہم فصل ۷)۔ خدا کی ذات تمام کائنات کا مرکز ہے اور اس سے دور رہنا گویا اپنی فطرت سے بغاوت کرنا ہے اور اس سے رابطہ پیدا کرنا اپنی فطرت اور کائنات سے ہم آہنگ ہونے کے مترادف ہے۔ انسانی عروج وصعود کا مفہوم فلاطینوس کی نگاہ میں کسی ایسی منزل کی طرف جانا نہیں جس سے پہلے ہم جدا تھے، وہ تو انسانی انا اور ذات کے اندر گم ہونا ہے جو اپنی اتھاہ گہرائیوں میں خدائے مطلق کے ساتھ مربوط ہے۔

لیکن اس حرکتِ صعودی میں انسانی انا کا انفرادی وجود اور اس کی جسمانی زندگی کا ارتقا بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ جب ہم نچلے درجے سے ترقی کر کے اوپر کے درجے میں قدم رکھتے ہیں تو یہ ترقی صرف خارجی ترقی تو ہے لیکن حقیقی نہیں کہلا سکتی کیونکہ جو کچھ انسان ایک منزل پر حاصل کر چکا ہوتا ہے اس کی بنیاد پر اگلی تعمیر ہو تو وہ تو حقیقی ارتقا ہوگا لیکن اگر اگلی منزل پر پہنچ کر پچھلی منزل کی ہر چیز سے انحراف کیا جائے اور اس کی مکمل نفی کر دی جائے تو یہ دوسری منزل تو نہیں کہلا سکتی۔ فلاطینوس کے ہاں سلبیت کا رجحان اتنا نمایاں ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ روحانی ارتقا کا تصور اس کے ہاں بالکل سلبی اور منفی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی انسان مختلف منازل طے کرتا ہوا وحدتِ مطلقہ تک رسائی حاصل کرتا ہے تو وہ وحدتِ مطلقہ سلبیتِ خالصہ ہوتی ہے جس میں تمام کائنات موجود نہیں بلکہ جو ان تمام سے مطلق ماورا ہے۔ اس طرح حرکتِ صعودی گویا ایک مکمل سلبیت ہے جو فنائے مطلق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب انسان مختلف منازل طے کرتا ہوا آخری مقصود تک پہنچتا ہے تو اس تمام تگ و دو کا نتیجہ اس موجودہ زندگی کے لیے کچھ خوشگوار تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوتا۔ کیا عقل استدلالی اور وجدان کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟ اگر ہے تو وجدانی مرتبے تک پہنچنے کے بعد عقل استدلالی کا حکم جاری رہنا چاہیئے لیکن فلاطینوس کی عقل یہ تو تسلیم کرتی ہے کہ نزول کے وقت عقل استدلالی وجدان کی نچلی کڑی ہے۔ لیکن جب معاملہ صعود و عروج کا ہوتا ہے تو یہ تعلق یک قلم مرفوع ہو جاتا ہے۔ وجدان تک پہنچتے پہنچتے انسان کی عملی زندگی کی دلچسپیاں بالکل ختم ہو جاتی ہیں اور پھر انسان اس زندگی کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس کے بعد اس کا مقصد محض مشاہدات اور سیر فی اللہ رہ جاتا ہے۔ تمام کائنات اور دوسرے انسانوں سے مربوط رشتوں میں منسلک ہونے کا احساس ہمیں معاشرے کی بھلائی کے دنیاوی کاموں کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ ان سے کلی طور پر منقطع ہونا سکھاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں تصوف اور خاص کر فلاطینوس

---

[1] التسعہ باب ششم، کتاب ۲، فصل ۲۵ صفحہ ۵۸۶ - ۵۸۹

کے زیر اثر پیدا شدہ تصوف میں رہبانیت اور زندگی گریز اور منفیانہ رجحانات نے تقویت پائی۔

جب کوئی شخص اپنے تجربات اور واردات سے گزر کر مشاہدۂ حقیقی سے سرفراز ہوتا ہے تو اس وقت اس کا علم و تجربہ ایک حیثیت سے تو یقیناً بہت گہرا اور وسیع ہوتا ہے لیکن اس کو ادا کرنا اور الفاظ میں بیان کرنا اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ وہ تشبیہات اور استعارے استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن جن حقائق کی یہ نشان دہی کرتے ہیں وہ متضاد تصورات کے حامل ہوتے ہیں۔ خدا وہ ذات ہے جس میں سب گم ہیں اور پھر وہ سب کو محیط بھی ہے۔ غرض کہ اس کا نتیجہ لاادریت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا لیکن جب ایسا شخص لاادری (میں نہیں جانتا) کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس کے پاس کوئی علم نہیں۔ جانتا تو وہ بہت کچھ ہے لیکن اس کا علم ہمارے مقررہ پیمانوں اور مروجہ اصطلاحات کے اندر نہیں سما سکتا مگر اس احساسِ کوتاہی کے باوجود اس کے ذہن و قلب میں جو انقلاب پیدا ہوتا ہے اس کے اثرات محض اس کے داخلی نفس کی تبدیلی تک محدود نہیں رہتے بلکہ خارجی دنیا میں اس کی حیثیت یکسر بدل جاتی ہے۔ نفسی تبدیلی کے زیر اثر دوسرے انسانوں اور معاشرے کے ساتھ اس کا تعلق زیادہ فائدہ مند شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے وہی اعمال و افعال سرزد ہوتے ہیں لیکن اب ان کی روح مختلف ہوتی ہے، اس کا نقطۂ نگاہ بدل چکا ہوتا ہے اور وہ ہر معاملہ کو اس بلندی اور آفاقی حیثیت سے دیکھتا ہے جو ایک مشاہدۂ حقیقت سے مسرور انسان کا خاصہ ہے۔ انسانی تاریخ میں پیغمبروں اور مصلحین نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ انہی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ ان کی زندگی میں سلبیت کا اپنا مقام ہے، انہوں نے عارضی طور پر زندگی اور اس کے تقاضوں سے مکمل طور پر منہ موڑ لیا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں مکمل اثباتیت بھی موجود ہے، تکمیلِ اخلاق اور مکمل قلبِ ماہیت کے بعد جب دوبارہ انہوں نے زندگی کے روزمرہ مسائل کی طرف رُخ کیا تو معاشرے کی کایا پلٹ دی اور انسانوں کو ایک ایسے راستے پر گامزن کر دیا کہ آن کی آن میں فتنہ و فساد کی جگہ امن و آشتی نے لے لی۔ یہی وہ بات ہے جو فلاطینوس کے فلسفہ و تصوف میں موجود نہیں۔ اس کے نزدیک صحیح صوفی کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو کسی مقدس خانقاہ میں داخل ہونے سے پہلے نہ صرف اس مادی دنیا کے ملوثات سے پاک ہو جائے بلکہ تمام ملبوسات کو اتار دے تاکہ اس پاکیزہ ماحول میں اس گندی دنیا کے لوازمات اور تصورات اس کی یکسوئی کو خراب نہ کر سکیں۔ اس قسم کی زندگی کا نتیجہ صاف ہے کہ فلاطینوس کے نزدیک عملی اخلاق محض ایک منزل بیرونِ در ہے اور جونہی اس کے بعد انسان کو اس مقدس حلقے میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے تو اخلاق کی وقعت اور قدر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ عملی زندگی کے بعد محض مشاہدات کی زندگی ہے، اور اس کے بعد محض مشاہدۂ حق کی لذت۔ یہ انتہائی منزل خالص منفیانہ شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے انسان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کے لیے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو پاتا۔ انسانی زندگی کے مختلف مراتب مادی، فکری، وجدانی ایک ارتقائی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد اور متمیز ہوتے ہوئے بھی ایک

برتر وحدت میں مربوط اور ہم آہنگ اجزا کی طرح کام کرتی ہیں۔ نچلی منزل اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح بالائی منزل اور ان سب سے کام لے کر ہی انسان صحیح ارتقا کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے۔ عالم روحانی کوئی مادی دنیا سے علاحدہ چیز نہیں کہ اس کے حصول کے لیے ہمیں ایک کو ترک کرنا پڑے بلکہ وہ بھی مادی دنیا ہی ہے جس میں رہ کر انسان ایک بلند مقصد کے لیے کوشش کرتا ہے اور روحانی عزائم کی تکمیل کے لیے اس کو مسخر کرتا ہے۔

اس زندگی گریز رجحانات کے باوجود جب فلاطینوس کے تصورات کا مقابلہ عرفانی حکما و صوفیا کے ساتھ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک حیثیت میں کم از کم اس کا نظریہ اتنا مایوس کن نہ تھا۔ عرفانیوں کا خیال تھا کہ یہ کائنات خدائے مطلق کی تخلیق کا نتیجہ نہیں بلکہ شیطان کی ابلیسیت کا کارنامہ ہے۔ انسانی ارواح جب اس مادی کائنات میں وارد ہوتی ہیں تو شیطانیت کے بُرے اثر سے ملوث ہو جاتی ہیں۔ ان کی نجات ان کے اپنے اعمال و افعال کے ذریعے ممکن نہیں، عالم بالا سے ایک نجات دہندہ ہی ان کو اس قید سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ فلاطینوس کے لیے عرفانیوں کے اس عقیدہ کو تسلیم کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ مادی کائنات فطرتاً بد نہیں اور نہ وہ شیطان کے ہاتھوں ظاہر ہوئی اگرچہ اس میں بدی اور شر کے اجزا ضرور ہیں۔ یہ کائنات بہترین اور خوبصورت ترین ہے اگرچہ وہ عالم بالا کا محض عکس ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

"اُس عالم بالا کے عکس کی حیثیت سے اس ہماری دنیا سے خوبصورت کون سی چیز ہو سکتی ہے؟ وہاں کی آگ کا بہترین عکس ہماری دنیا سے بہتر کہیں پایا جا سکتا ہے؟ ہماری زمین سے بہتر کوئی زمین تصور میں نہیں آسکتی۔ یہ ہمارا کرّہ جو اپنے مقررہ راستہ پر گامزن ہے، عالم بالا کے کرّے کے عکس کی حیثیت سے بہترین ہے۔" (کتاب دوم، باب ۹، فصل ۴)[1] عرفانیوں کا خیال تھا کہ انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے لیکن فلاطینوس کا خیال ہے کہ اس کائنات کی ظاہری خوبصورتی عالم بالا کی خوبصورتی کا عکس ہے اور اس لیے جو شخص اس خوبصورتی کو دیکھ کر عالم بالا کی خوبصورتی کا تصور نہیں لاتا وہ روحانیت سے بالکل معرا ہے۔ "وہ کونسا موسیقار ہے جس نے عالم بالا کی موسیقی سنی ہو اور اس عالم حسیات کی موسیقی سن کر اس کے جذبات میں تلاطم نہ پیدا ہوا ہو؟ وہ کونسا سائنسدان ہے جو حساب اور ہندسہ کے علوم سے واقف ہو اور جو اس کائنات کے مختلف حصوں اور متناسب حرکت، ہم آہنگی اور ترتیب کو دیکھ کر خوش نہ ہوتا ہو؟ وہ شخص جو ایک تصویر کو دیکھتا ہے درحقیقت اُسی وقت اس سے پوری طرح لذت اندوز ہو سکتا ہے جب وہ اس میں مثالی خوبصورتی کے عکس کا معائنہ کرتا ہے اور اس لذت و سرور سے مدہوش

---

[1] صفحہ ۱۳۵ - ۱۳۶

ہوکر وہ عالم بالا کی یاد میں محو ہو جاتا ہے۔ یہی وہ یاد ہے جو عشق الٰہی کی بنیاد ہے۔ اس کائنات کی خوبی، ان فلکی اجسام کا نورانی جلوہ، اشیائے مادی کی ترتیب و ہم آہنگی ـــــ آخر وہ کونسا بدذوق انسان ہے جس کے دل میں اس نظارہ کو دیکھ کر عالم بالا کی تڑپ پیدا نہ ہو؟" (کتاب دوم، باب ۹، فصل ۱۶) فلاطینوس کے نزدیک یہ کائنات خدا کی بلا واسطہ تربیت اور نگرانی میں ارتقائی منازل طے کر رہی ہے اس لیے اس کے متعلق یہ رائے پیش کرنا کہ یہ عین بدی اور شر ہے انسان اور خدا کی توہین ہے۔

لیکن اس کے باوجود فلاطینوس اس حقیقت سے غافل نہیں تھا کہ اس دنیا میں مختلف قسم کی بدیوں کا وجود موجود ہے، طبعی اور اخلاقی شر سے ہمیں ہر وقت واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ چیز خدا کی طرف کسی طرح بھی منسوب نہیں کی جا سکتی کیونکہ خدا اس عالم انسانی کی تخلیق کا بلا واسطہ باعث نہیں۔ اس کے خیال میں کسی تخلیقی عمل کا انتساب اس کی طرف جائز نہیں اس کا عمل اگر کوئی ہے تو وہ صرف اس کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اگرچہ نچلے مراتب کا وجود اس کے وجود کا مرہون منت ہے تاہم وہ ان کا ذمہ دار نہیں۔ ہر وجود اپنے سے بالا مرتبے کے وجود سے ظاہر ہوا بغیر کسی نیت یا ارادے کے اور اس طرح وہ نچلے مرتبے کے وجود کے نقائص کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چنانچہ خدا جو انسانوں اور مادی کائنات سے کئی مراتب پرے ہے اس لیے وہ ان عیوب و نقائص سے پاک ٹھہرا لیکن اس تصور میں کوئی منطقی خوبی نہیں اور نہ اس طریقے سے خدا کی ذمہ داری ختم ہو سکتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس بدی کا باعث انسان کی اپنی آزادی اور اختیار ہے جو اس کو غلط راستے پر لے جاتی ہے۔ کبھی وہ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ کائنات بھی ایک کھیل ہے جس میں انسان مختلف پارٹ ادا کرتا ہے اور جب وہ اپنا پارٹ ختم کر لیتا ہے تو اس دنیا کی بندشوں سے آزاد ہو کر خیر مطلق کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر اس دنیا میں بدی کا وجود ہے خواہ اس کی وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، تو کیا یہ انسان کا فرض نہیں کہ اس دنیا سے بدی اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے یا کم از کم اس کی شدت میں کمی کرنے کی کوشش کرے؟ یہاں آکر فلاطینوس کی رجائیت قنوطیت میں بدل جاتی ہے۔ اگر ایک شخص یہ تسلیم کرے کہ یہ کائنات حسن و خوبی کا بہترین مرقع ہے چونکہ یہ حسن ازلی کا پرتو ہے، جو شخص اس حقیقت کو (عرفانیوں کے مقابلے پر) بڑے جوش و خروش سے پیش کرتا ہو کہ ذات مطلق بلا واسطہ اس کائنات اور انسان کی زندگی پر ہر لمحہ نگراں ہے اور ان کی بھلائی میں کوشاں، ایسے شخص کے لیے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ وہ ہر اس کوشش پر لبیک کہے جو اس مادی دنیا اور انسانی معاشرے کی بھلائی اور روحانی ترقی کی خاطر کی جائے۔ لیکن فلاطینوس کا ذاتی رجحان اس قسم کا تھا کہ اس طرح کے فعالی جذبے کی حمایت اس سے ممکن نہیں تھی۔ حضرت عیسٰے نے اپنی بلند اخلاقی تعلیم سے اس قسم کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی زندگی اس نہج پر استوار ہو

لہ صفحہ ۱۱۹

کہ اس مادی دنیا کے نظام میں خوشگوار انقلاب پیدا ہو سکے۔ لیکن فلاطینوس اس قسم کے انقلاب کا کبھی حامی نہ ہو سکا۔ اس کا خیال تھا کہ حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان مادی بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے، ان میں تبدیلی سے نہیں۔ آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت بدل نہیں سکتی۔ یہی وہ زندگی گریز نظریہ تھا جس نے بدقسمتی سے بعد میں عیسائیت پر بھی حملہ کیا اور کافی مدّت تک وہ رہبانیت سے نجات حاصل نہ کر سکی۔ عیسائی عرفانیوں کی طرح یہ تو نہ کہہ سکے کہ یہ دنیا شیطان کی پیداوار ہے لیکن مادہ اور روح، دنیا اور آخرت، داخلیت اور خارجیت کی ثنویت سے بچ نہ سکے۔

فلاطینوس کے تصوف کی آخری منزل رویت خداوندی ہے۔ اس کے شاگرد اور سوانح نگار فور فریس۔ Porphyry کے بیان کے مطابق اسے زندگی میں کئی بار اس سرور اور لذت کا تجربہ ہوا۔ اس کی کیفیت کے متعلق التسعہ[1] میں کئی جگہ اس نے ذکر کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کے اپنے الفاظ درج کرتے ہیں:

"عقلِ استدلالی اس مقصودِ اعلیٰ بسیط مطلق تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ اس کے لیے تو صرف الہٰی وجدان کی ضرورت ہے لیکن اس تجربہ کے متعلق کچھ کہنا ہماری قدرت سے ماوراء ہے۔ جب واردات ختم ہو جائے تو پھر استدلال سے اسے بیان کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ ہی اس کے وجود کی دلیل ہے کیونکہ اچانک روشنی ہماری روح کو منور کر دیتی ہے۔ یہ نور اسی وحدتِ مطلقہ کی طرف سے آتا ہے بلکہ یوں کہنا بہتر ہو گا کہ یہ نور ہی وحدتِ مطلقہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وحدت ہر جگہ موجود ہے۔ جب قلب میں اس کا نور چمکتا ہے تو گویا اس نے اپنے مقصود کو پالیا۔ روح کا صحیح مقصد اور انجام یہی ہے کہ اسی نور کی روشنی میں نورِ مطلق کا مشاہدہ کرے اُسی طرح جس طرح سورج کی روشنی میں سورج کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ چیز کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اپنے نفس کو ہر چیز سے پاک کرنے سے۔"

"روح کو خیر اور شر اور ہر قسم کی دوسری چیزوں سے اپنے آپ کو پاک کرنا چاہیئے تاکہ وہ صرف وحدتِ مطلقہ کا استقبال کر سکے۔ جب روح ہر مادی اور حسّی چیز سے علاحدہ ہوتی ہے اور اپنے آپ کو ہر آلائش سے پاک صاف کر لیتی ہے تو پھر وہ خدائے مطلق کے ساتھ واصل ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ دو نہیں رہتے بلکہ ایک ہو جاتے ہیں۔ جب تک مشاہدۂ ذات رہتا ہے دوئی کی گنجائش نہیں۔ اس وصل کی ایک دھندلی اور نامکمل شکل اس مادی دنیا میں آدمی اور عورت کا وصل ہے۔ جب مسلسل کوشش کے بعد حضوری ہوتی ہے تو اس وقت اس کے سامنے اپنا وجود نہیں ہوتا، وہ نہیں جانتا کہ وہ خود کیا ہے، اس وقت وہ نورِ مطلق اس کے قلب و ذہن پر اتنا حاوی ہوتا ہے کہ سوائے

---

[1] التسعہ صفحہ ۱۹۹-۲۰۰

اس کے اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا۔ اس وقت کے سرور کے لیے تو وہ جنت کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ یہ روح کی بلند ترین منزل ہے۔ یہاں پہنچ کر کسی قسم کے دھوکے یا تلبیس کا کوئی امکان نہیں۔ آفتاب دلیل آفتاب ہے حقیقت سے بڑھ کر کونسی سچائی اور صداقت ہوسکتی ہے۔ اس کی راحت و لذت جسمانی اور حسی لذت کے مشابہ نہیں۔ یہ وہ سعادت ہے جو روح کو اس فانی دنیا میں آنے سے پہلے میسّر تھی۔ اس وقت ہر دنیاوی خواہش جو کبھی اس کی نگاہ میں عزیز تھی — قوت، دولت، حسن، علم وغیرہ —— ہیچ و بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ شر اور بدی کا خوف اس سے دور ہوجاتا ہے خواہ ارد گرد کی ہر چیز فنا ہوجائے اسے اس کی بالکل پروا نہیں ہوتی۔[1] (۶، ۷، ۲۴)

”جس طرح مادہ اپنی ہیولائی شکل میں ہر قسم کی صورت سے معرا ہوتا ہے اور تبھی وہ مختلف صورتوں کو اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح روح کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے خارجی اثرات سے پاک و صاف کرے تاکہ وہ ذاتِ مطلق کی تجلی اور اس کے دیدار کی لذت سے سرفراز ہوسکے۔ اس کے بعد وہ واصل بہ حق ہوسکتی ہے۔ اس مشاہدۂ ذات کے بعد جب وہ سیر حاصل ہوکر اس سے گفتگو کرلیتی ہے تو وہ اس دنیا کی طرف واپس آتی ہے اور اپنے مشاہدے کے متعلق دوسروں کو بتانے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ خدا کے ساتھ اس طرح کا مشاہدہ اور گفتگو یونانی صنمیات میں مائی نوس (Minos)[2] کے نام منسوب ہے۔ اسی مشاہدہ اور گفتگو کی روشنی میں اس نے اپنے ملک کے لیے قوانین وضع کیے۔ لیکن شاید وہ انسان جس نے عالمِ بالا کا بہت زیادہ مشاہدہ کیا ہو سیاسیات کو اپنی حیثیت سے گرا ہوا سمجھے اور اس دنیا اور اس کے دھندوں سے علاحدہ رہنے کو ترجیح دے۔ خدا جیسا کہ ہم نے پڑھا ہے (جیسا کہ افلاطون نے کہا ہے) ہم سے دور نہیں، وہ ہم سب میں موجود ہے اگرچہ ہم جانتے نہ ہوں . . . .

”ہم ہمیشہ اس وحدتِ مطلقہ کے ارد گرد گھومتے ہیں لیکن ہماری نگاہ ہمیشہ اس پر مرکوز نہیں رہتی۔ ہماری مثال ان سرود خوانوں کی سی ہے جو ایک سربراہ موسیقار کے ارد گرد کھڑے ہیں لیکن چونکہ ان کی توجہ بعض خارجی اشیا کی طرف بٹی ہوئی ہے اس لیے ان کا گانا سُر اور تال میں نہیں ہوتا۔ جب وہ سربراہ کی طرف پوری توجہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا گانا درست ہوجاتا ہے . . . . . اس سرودی ناچ میں انسان زندگی کا سرچشمہ، وجود کا مصدر، خیر کی علت اور روح کی بنیاد کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ صفات وحدتِ مطلقہ کے فیض سے جاری ہوتی ہیں بغیر اس کے کہ اس کی ذات میں کوئی کمی واقع ہو۔ اگرچہ جسم کے باعث اس میں اور ہم میں ایک قسم کی جدائی اور علاحدگی حائل ہے تاہم مستقل غیریت ممکن نہیں کیونکہ ہمارا وجود، ہماری زندگی اور

---

[1] التسوعہ، صفحہ ۵۸۸

[2] مائی نوس جزیرۂ کریٹ کا افسانوی بادشاہ تھا۔ نو سالہ دورِ حکومت کے بعد وہ ایک غار میں پہنچا جو دیوتا زوئیس (Zeus) کے نزدیک بہت مقدس تھی۔ وہاں اس نے دیوتائے اعظم سے ملاقات کی جہاں پر اسے کئی قوانین تیار ملے۔ کریٹ کا قدیم تمدن، مائنوئین Minoan اسی کے نام سے منسوب ہے۔ دیکھئے
A dictionary of classical Antiquities by H. N. Nettleship.

ہمارا نفس سب اسی مصدرِ حیات کے مرہونِ منّت ہیں لیکن ہم حقیقی طور پر تبھی زندہ کہلانے کے مستحق ہیں جب ہم اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں اور اسی میں ہماری سعادت ہے۔ اس سے دور رہ کر ہماری شقاوت اور کمتری ہے۔ اسی میں ہماری روح کو تمام شرور سے حفاظت اور اطمینان ملتا ہے۔ وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہوتی ہے جس میں کسی بدی کو راہ نہیں۔ وہاں اسے مشاہدۂ ذات میسّر آتا ہے، ہر قسم کے نفسانی جذبات اور اندیشوں سے آزاد اور حقیقی زندگی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ ہماری موجودہ زندگی جو خدا سے غیریت پر مبنی ہے، محض دکھاوا اور نمائش ہے ..... اس شخص کو جسے اس قسم کی واردات (یعنی مشاہدۂ ذات) کا تجربہ نہیں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس دنیا میں کتنی خوشی کا موقع ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنے محبوب سے وصل حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اگرچہ دنیاوی زندگی کی صحبتیں فانی ہیں۔ ہماری محبت اور الفت کا صحیح حقدار تو وہی ذات اقدس و اعلیٰ ہے جس کو ہم حاصل کر سکتے اور حاصل کرنے کے بعد اس سے جدا نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ غیر فانی ہے۔ وہ شخص جس کو اس کا تجربہ ہے جانتا ہے کہ اس میں کس قدر حقیقت ہے، اس میں کتنا سرور ہے، زندگی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ اس عالم میں جلدی پہنچنے کی کوشش کریں جسم سے جس سے بدقسمتی سے ہم وابستہ ہو چکے ہیں زیادہ سے زیادہ چھٹکارا حاصل کریں، اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا سے بغلگیر ہوں۔ اس مشاہدے سے ہمیں احساس ہوگا کہ ہمارا قلب نور سے منور ہو چکا ہے بلکہ ہم خود مجسم نور بن چکے ہیں ....."

"(اس مشاہدہ کے دوران میں) ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ وہ دیکھتا ہے بلکہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہی ہو جاتا ہے یعنی غیریت اور دوئی مکمل طور پر ساقط ہو جاتی ہے۔ وہ ذاتِ خداوندی میں اس طرح مدغم اور واصل ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا انفرادی وجود غائب ہو جاتا ہے۔ ان کی مثال دو ہم مرکز دائروں کی سی ہے۔ جب دونوں منطبق ہو جائیں تو ایک ہو جاتے ہیں اور جب علاحدہ ہوں تو دو۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشاہدے کا بیان کرنا بہت محال ہے۔ کیونکہ اس چیز کو ایک غیر اور معروض کی حیثیت میں کس طرح بیان کیا جائے جب کہ مشاہدہ میں مشہود اور شاہد دونوں ایک ہوں۔"

"یہی وجہ ہے کہ باطنی اور صوفیانہ طریقوں میں ایک نابلد شخص کو ان حقائق سے واقف کرنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔ روحانی تجربات غیر حسی ہونے کی وجہ سے عقل کی دسترس سے باہر ہیں اور اس لیے وہ لوگ جو اس کے سرور سے ناآشنا ہیں اس کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مشاہدے میں دوئی نہیں ہوتی بلکہ شاہد اور مشہود ایک ہوتے ہیں (کیونکہ شہود عام دیکھنا نہیں بلکہ مدغم ہونا ہے)۔ اگر انسان اس حالتِ شہود و ادغام میں اپنی حیثیت کی نوعیت و ماہیت کو حافظہ میں رکھ سکنے میں کامیاب ہو جائے تو گویا اس کے سامنے اس خدائے قدوس کا عکس موجود رہے گا۔ اس حالت میں وہ مشہود کے ساتھ مدغم ہو چکا تھا اور ہر قسم کی دوئی اور غیریت کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ اس وقت اس کے قلب میں کوئی جذبہ موجزن نہیں تھا نہ غصہ نہ نفسانی خواہش، حتیٰ کہ عقل و وجدان۔ اپنی خودی کا احساس تک بھی موجود نہ تھا۔ تواجد کی حالت میں وہ مکمل اطمینان اور سکون کا مجسمہ، خدا کے نور سے منور اور سرورِ کامل سے بھرپور۔ اس خود فراموشی کی حالت میں اس کی نظر دائیں بائیں

نہیں گھومتی، حتیٰ کہ خود اس کی اپنی ذات بھی مرکزِ توجہ نہیں ہوتی ۔ وہ مکمل سکون کی حالت میں ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ وہ خود مکمل سکون بن جاتا ہے۔ اس وقت انسان حسن و اخلاق کی سرحدوں سے بالا ہو جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جب انسان اپنے آپ کو خدا سے متحد پاتا ہے تو اپنی ذات میں خدا سے تشابہ محسوس کرتا ہے اور اگر وہ اپنی ذات سے گزر کر اس ذاتِ متعالی کی طرف رجوع کرتا ہے تو گویا اس نے اپنے راستے کی منزل کو پالیا۔ جب وہ اس مشاہدۂ ذات سے مسرور ہو کر لوٹ کر آتا ہے تو اس کی داخلی نیکیاں اس میں عود کر آتی ہیں اور اس حالت میں وہ پھر صعود و عروج کی منزلیں طے کرتا ہوا روحِ کل کی طرف بڑھتا ہے اور آخر کار ذاتِ واحد سے دوبارہ ملحق ہو جاتا ہے۔ یہی زندگی دیوتاؤں، نیک اور سعید لوگوں کی ہے ـــــ اس مادی زندگی کے تمام بندھنوں سے آزاد، ایک ایسی زندگی جس میں حسی اور جذباتی میلانات کی کشش بالکل ختم ہو چکی ہوتی ہے، ایک تنہا روح کی پرواز تنہا روحِ اعلیٰ (یعنی خدا) کی طرف ۔"

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق

مصنفہ بشیر احمد ڈار

عہد قدیم میں چین، ایران، مصر اور یونان کی تہذیبوں نے حیرت انگیز ترقی کر لی تھی، اور یہاں کے مفکروں نے جو افکار و نظریات پیش کئے انہی کی بنیاد پر جدید افکار کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی ہے چنانچہ اس کتاب میں کون فیوشس، گوتم بدھ، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم مفکروں کے اخلاقی نظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت چھ روپے

اسلام اور رواداری

مصنفہ رئیس احمد جعفری

قرآن کریم اور حدیث نبوی کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا حسن سلوک روا رکھا ہے اور انسانیت کے بنیادی حقوق ان کے لیے کس طرح اعتقاداً اور عملاً محفوظ کئے ہیں۔ حصہ اول صفحات ۴۳۲ قیمت ۴/۷۔ حصہ دوم صفحات ۴۷۴ قیمت ۸/۷ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور